ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2629

Program: M.A. Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت)

کورس: اسلام کا معاشرتی وسیاسی نظام (2629) • سطح: ایم اے علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1–5)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 40

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: علم معاشرت کا مفہوم اور تاریخ (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ علم معاشرت کا مفہوم اور تاریخ بیان کریں۔ (20)

تعارف

علم معاشرت، جسے انگریزی میں سوشیالوجی (Sociology) کہا جاتا ہے، جدید سماجی علوم میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان فطرتاً ایک سماجی وجود ہے؛ وہ تنہا نہیں رہ سکتا بلکہ خاندان، قبیلے، برادری اور ریاست جیسے اداروں کے اندر زندگی گزارتا ہے۔ جب انسانوں کے باہمی تعلقات، رسوم و رواج، ادارے اور سماجی تبدیلیاں باقاعدہ مطالعے کا موضوع بن جائیں تو اسی منظم مطالعے کو علم معاشرت کہتے ہیں۔ کسی بھی قوم کی ترقی، اس کے مسائل کے حل اور اس کی پالیسی سازی کے لیے اپنے معاشرے کو سائنسی انداز میں سمجھنا ناگزیر ہے، کیونکہ سماجی حقائق کو سمجھے بغیر نہ غربت اور جرائم جیسے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ تعلیم و صحت جیسی خدمات درست سمت میں فراہم کی جا سکتی ہیں۔

اس جواب میں پہلے علم معاشرت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کی وضاحت کی جائے گی، پھر اس کی تعریفات، موضوع اور دائرہ کار بیان ہو گا، اور اس کے بعد اس علم کی تاریخ کو قدیم دور سے لے کر جدید دور تک مرحلہ وار پیش کیا جائے گا۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو گی کہ سماج کے بارے میں غور و فکر تو قدیم زمانے سے جاری ہے، لیکن اسے ایک مستقل اور سائنسی علم کی صورت انیسویں صدی میں ملی، اور مسلم مفکرین بالخصوص ابن خلدون نے اس کی بنیادوں میں بہت معمولی کردار ادا کیا۔ آخر میں اس علم کی اہمیت اور اس کے مطالعے کے مقاصد پر نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔

علم معاشرت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

لفظ سوشیالوجی دو زبانوں کے الفاظ سے مرکب ہے: لاطینی لفظ سوسیس (Socius) جس کے معنی ساتھی، رفیق اور سماج ہیں، اور یونانی لفظ لوگوس (Logos) جس کے معنی علم، مطالعہ اور بحث ہیں۔ اس طرح لغوی اعتبار سے سوشیالوجی کا مطلب ہے سماج کا علم یا معاشرے کا مطالعہ۔ اردو میں اس کے لیے علم معاشرت، علم عمرانیات اور سماجیات جیسی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ علم عمرانیات کی اصطلاح ابن خلدون کے علم العمران سے ماخوذ ہے، جبکہ علم معاشرت عام فہم اور اس کورس کی کتاب میں مستعمل اصطلاح ہے۔ اصطلاحی مفہوم میں علم معاشرت وہ علم ہے جو انسانی معاشرے، سماجی تعلقات، سماجی اداروں، گروہوں، رسوم و رواج، اقدار اور سماجی تبدیلی کا منظم اور سائنسی مطالعہ کرتا ہے۔

مختلف مفکرین نے اس علم کی تعریف اپنے اپنے زاویے سے کی ہے۔ ایک سادہ اور جامع تعریف یہ ہے کہ علم معاشرت انسانی سماجی زندگی، گروہوں اور معاشروں کا سائنسی مطالعہ ہے۔ درخائم کے نزدیک سماجی حقائق یعنی وہ طریقے، رسوم اور ادارے جو فرد سے باہر موجود ہوتے ہیں اور اس پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس علم کا اصل موضوع ہیں۔ میکس ویبر نے سماجی عمل کی تفہیم پر زور دیا، یعنی انسان دوسروں کے رویے کو مدنظر رکھ کر جو بامعنی عمل کرتا ہے اسے سمجھنا علم معاشرت کا کام ہے۔ ان تعریفات کا مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ یہ علم فرد کو تنہا نہیں بلکہ سماج کے تناظر میں دیکھتا ہے کیونکہ انسان کی شخصیت، زبان، اخلاق اور عادات سب سماج ہی سے تشکیل پاتی ہیں۔

علم معاشرت کا موضوع اور دائرہ کار

علم معاشرت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں خاندان، شادی، مذہب، تعلیم، سیاست، معیشت اور میڈیا جیسے بنیادی سماجی اداروں کا مطالعہ شامل ہے۔ اسی طرح طبقات، ذات پات، نسلی اور لسانی گروہ، شہری اور دیہی زندگی، سماجی طبقات کی تقسیم، جرائم اور انحراف، آبادی کے مسائل اور سماجی تبدیلی کے اسباب و نتائج بھی اس کے موضوعات ہیں۔ یہ علم یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ سماجی ادارے کس طرح بنتے ہیں، کس طرح کام کرتے ہیں، ان میں تبدیلی کیوں اور کیسے آتی ہے اور فرد اور معاشرے کا باہمی تعلق کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم معاشرت کا تعلق تاریخ، معاشیات، سیاسیات، نفسیات اور بشریات جیسے علوم سے گہرا ہے اور اسے اکثر سماجی علوم کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

طریقہ کار کے اعتبار سے علم معاشرت ایک سائنسی علم ہے۔ یہ مشاہدے، سروے، انٹرویو، شماریاتی تجزیے اور تاریخی و تقابلی مطالعے جیسے طریقے اختیار کرتا ہے۔ سائنسی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ذاتی پسند ناپسند کے بجائے شواہد اور دلائل کی بنیاد پر نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ البتہ انسانی معاشرہ تجربہ گاہ کے مادے سے مختلف ہوتا ہے، اس لیے اس علم میں مکمل تجرباتی درستگی ممکن نہیں ہوتی اور تعبیر و تفہیم کو بھی اہمیت حاصل رہتی ہے۔ پھر بھی منظم طریقہ کار کی وجہ سے یہ علم سماجی مسائل کی تشخیص اور ان کے حل کی تجاویز میں دوسرے علوم سے زیادہ معتبر مقام رکھتا ہے اور حکومتی پالیسی سازی میں اس کے نتائج سے بھرپور استفادہ کیا جاتا ہے۔

قدیم دور میں سماجی فکر

سماج کے بارے میں غور و فکر کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود تہذیب۔ یونانی مفکرین میں افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریہ میں مثالی ریاست اور انصاف پر مبنی معاشرے کا تصور پیش کیا اور معاشرے کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے ہر طبقے کے فرائض متعین کیے۔ ارسطو نے انسان کو سماجی حیوان قرار دیا اور کہا کہ جو شخص معاشرے کے بغیر رہ سکے وہ یا حیوان ہے یا دیوتا۔ ارسطو نے خاندان، غلامی، شہریت اور ریاست کی اقسام پر منظم بحث کی۔ اگرچہ ان مفکرین کی بحث فلسفیانہ تھی اور جدید معنوں میں سائنسی نہیں تھی، تاہم اس نے سماجی فکر کی بنیاد فراہم کی اور بعد کے مفکرین کے لیے راستہ ہموار کیا۔

مشرقی اور مسلم فکر میں بھی سماجی مباحث کی مضبوط روایت موجود ہے۔ چینی مفکر کنفیوشس نے خاندانی اور سماجی نظم و ضبط اور باہمی فرائض پر زور دیا۔ مسلم مفکرین میں الفارابی نے مدینہ فاضلہ کا تصور پیش کیا، الغزالی نے سماجی اخلاقیات پر گہری بحث کی اور سب سے بڑھ کر ابن خلدون نے چودھویں صدی عیسوی میں اپنی شہرہ آفاق کتاب مقدمہ میں علم العمران کی بنیاد رکھی۔ ابن خلدون نے عصبیت یعنی گروہی یکجہتی کے نظریے کے ذریعے ریاستوں کے عروج و زوال کی سائنسی توجیہ پیش کی، تمدن کی اقسام، شہری اور دیہاتی زندگی کے فرق، معیشت اور آبادی کے باہمی تعلق جیسے موضوعات پر ایسی بحث کی جو جدید علم معاشرت سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہے۔ اسی لیے بہت سے محققین انہیں علم معاشرت کا اولین بانی قرار دیتے ہیں۔

جدول: علم معاشرت کی تاریخ کے اہم مراحل اور نمایاں مفکرین

مرحلہ	نمائندہ مفکرین	نمایاں خدمت
قدیم فلسفیانہ دور	افلاطون، ارسطو، کنفیوشس	مثالی معاشرے، انصاف اور سماجی نظم پر فلسفیانہ بحث
مسلم فکر کا دور	الفارابی، الغزالی، ابن خلدون	مدینہ فاضلہ کا تصور اور علم العمران کی بنیاد
بانیان کا دور (انیسویں صدی)	آگست کومت، ہربرٹ اسپنسر	سوشیالوجی کی اصطلاح اور ارتقائی نظریہ

سماجی حقائق، طبقاتی کشمکش اور سماجی عمل کے نظریات	درخائم، مارکس، ویبر	کلاسیکی دور
ساختیاتی فعالیت اور وسطی سطح کے نظریات	پارسنز، مرٹن اور دیگر	جدید دور

انیسویں صدی: علم معاشرت کی باقاعدہ بنیاد

علم معاشرت کو ایک مستقل علم کی صورت انیسویں صدی کے یورپ میں ملی۔ فرانسیسی انقلاب اور صنعتی انقلاب نے یورپی معاشرے کو جڑ سے بدل دیا تھا؛ پرانے ادارے ٹوٹ رہے تھے، شہر تیزی سے پھیل رہے تھے اور غربت، جرائم اور بدنظمی جیسے نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ ان حالات میں مفکرین نے سماج کو سائنسی انداز میں سمجھنے کی ضرورت محسوس کی۔ فرانسیسی مفکر آگست کومت نے 1838ء میں سوشیالوجی کی اصطلاح وضع کی اور اسے علوم کی درجہ بندی میں سب سے آخری اور پیچیدہ علم قرار دیا۔ کومت نے انسانیت کی فکری ترقی کے تین مراحل کا قانون پیش کیا یعنی مذہبی، مابعد الطبیعیاتی اور اثباتی مرحلہ، اور سماج کے مطالعے کے لیے مشاہدے اور تقابل پر زور دیا۔ انہی خدمات کی بنا پر کومت کو عام طور پر علم معاشرت کا بانی کہا جاتا ہے۔

انگریز مفکر ہربرٹ اسپنسر نے سماج کو جاندار جسم سے تشبیہ دی اور ارتقا کا نظریہ سماج پر لاگو کیا۔ اس کے نزدیک معاشرے سادہ سے پیچیدہ صورت کی طرف بڑھتے ہیں اور ان کے ادارے جسم کے اعضا کی طرح مل کر کام کرتے ہیں۔ اگرچہ اسپنسر کے بعض نظریات پر بعد میں تنقید ہوئی، مگر اس کی کتب نے علم معاشرت کو مقبول بنانے اور اس کے دائرے کو وسعت دینے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اسی دور میں جرمن مفکر کارل مارکس نے معاشرے کی توجیہ معاشی بنیادوں پر کی اور طبقاتی کشمکش کو تاریخ کا محرک قرار دیا۔ مارکس کی بحث اگرچہ معاشیات اور سیاست سے بھی جڑی تھی مگر اس نے سماجی طبقات، استحصال اور تبدیلی کے مطالعے کو علم معاشرت کا مرکزی موضوع بنا دیا۔

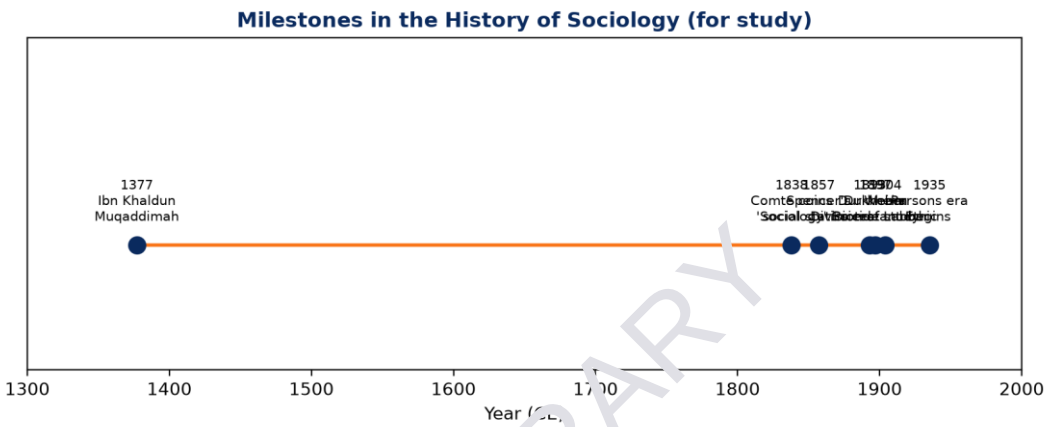

شکل: علم معاشرت کی تاریخ کے اہم سنگ میل (مطالعے کے لیے خاکہ)

کلاسیکی اور جدید دور کی ترقی

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ایمیل درخائم، میکس ویبر اور دیگر مفکرین نے اس علم کو مضبوط نظری بنیادیں فراہم کیں۔ درخائم نے سماجی حقائق کا نظریہ پیش کیا، محنت کی تقسیم اور خودکشی جیسے موضوعات پر شماریاتی مطالعے کیے اور یونیورسٹی سطح پر اس علم کی تدریس کی بنیاد رکھی۔ ویبر نے سماجی عمل کی تفہیم، مذہب اور معیشت کے تعلق اور نوکر شاہی جیسے موضوعات پر گراں قدر کام کیا۔ اس دور میں یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں علم معاشرت کے شعبے قائم ہوئے، تحقیقی مجلے شائع ہونے لگے اور یہ علم تدریسی نصاب کا باقاعدہ حصہ بن گیا۔ یوں علم معاشرت فلسفیانہ قیاس آرائی سے نکل کر باقاعدہ تحقیقی علم بن گیا۔

بیسویں صدی میں اس علم میں مزید وسعت آئی۔ ٹیلکٹ پارسنز نے ساختیاتی فعالیت کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق معاشرے کے تمام ادارے نظام کی بقا کے لیے باہمی ربط کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ رابرٹ مرٹن نے وسطی سطح کے نظریات اور ظاہری و پوشیدہ افعال جیسے تصورات دیے۔ دوسری طرف تنازعاتی مکتب نے طاقت اور عدم مساوات کو مرکزی اہمیت دی اور علامتی تعامل کے مکتب نے روزمرہ باہمی عمل کو مطالعے کا مرکز بنایا۔ آج علم معاشرت کی شاخیں بے شمار ہیں جن میں مذہب، تعلیم، خاندان، جرائم، طب، شہریات، دیہی زندگی اور ترقی کا علم معاشرت شامل ہے۔ پاکستان سمیت دنیا کی تمام بڑی یونیورسٹیوں میں یہ مضمون پڑھایا جاتا ہے اور سماجی منصوبہ بندی میں اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ علم معاشرت انسانی معاشرے، اس کے اداروں، تعلقات اور تبدیلیوں کا سائنسی مطالعہ ہے۔ اس فکر کی جڑیں قدیم یونانی اور مسلم مفکرین تک جاتی ہیں، ابن خلدون نے اسے علم العمران کی صورت میں منظم بنیاد دی، آگسٹ کومت نے اسے نام اور سائنسی پروگرام عطا کیا اور درخائم، ویبر اور مارکس جیسے مفکرین نے اسے مضبوط نظریات سے آراستہ کیا۔ آج یہ علم سماجی مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ طالب علم کے لیے اس کی تاریخ کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماجی علم کسی ایک قوم یا دور کی جاگیر نہیں بلکہ یہ انسانیت کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے، جس میں مسلم فکر کا حصہ نمایاں اور قابل فخر ہے۔

سوال نمبر2: علم معاشرت میں مغربی مفکرین کی خدمات(20نمبر)

سوال نمبر2۔ علم معاشرت میں مغربی مفکرین کی خدمات بیان کریں۔(20)

تعارف

علم معاشرت کی جدید صورت مغربی مفکرین کی مسلسل علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے یورپ میں جب صنعتی انقلاب، فرانسیسی انقلاب، شہری آبادکاری اور استعماری توسیع نے معاشروں کی ہیئت بدل دی تو وہاں کے مفکرین نے ان تبدیلیوں کو سمجھنے کے لیے نئے سوالات اٹھائے اور نئے نظریات پیش کیے۔ ان مفکرین نے سماج کے مطالعے کو فلسفے اور مذہبی تعبیرات سے نکال کر مشاہدے، شماریات اور تقابل پر مبنی علم بنانے کی کوشش کی، یونیورسٹیوں میں اس کے شعبے قائم کروائے اور ایسی اصطلاحات و تصورات وضع کیے جو آج بھی اس علم کی بنیاد ہیں۔

اس جواب میں نمایاں مغربی مفکرین کی خدمات الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کی جائیں گی۔ آگسٹ کومت کو اصطلاح اور سائنسی پروگرام دینے کا سہرا جاتا ہے، ہربرٹ اسپنسر نے ارتقائی اور عضویاتی نقطہ نظر پیش کیا، کارل مارکس نے طبقاتی کشمکش اور معاشی بنیاد کا نظریہ دیا، ایمیل درخائم نے سماجی حقائق اور سائنسی طریقہ کار کو مستحکم کیا اور میکس ویبر

نے تفہیمی مطالعے اور مذہب و معیشت کے تعلق پر اہم کام کیا۔ ان کے علاوہ ٹونس، زیمیل، پیریٹو، پارسنز اور مرٹن جیسے مفکرین کی خدمات کا بھی مختصر جائزہ لیا جائے گا تاکہ معلوم ہو کہ یہ علم کسی ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک طویل فکری روایت کی پیداوار ہے۔

آگست کومت کی خدمات

فرانسیسی مفکر آگست کومت (1798ء تا 1857ء) کو عام طور پر علم معاشرت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے 1838ء میں سوشیالوجی کی اصطلاح وضع کی اور اپنی شہرہ آفاق تصنیف میں اس علم کا مفصل خاکہ پیش کیا۔ کومت نے انسانی فکر کی ترقی کا مشہور قانون پیش کیا جس کے مطابق انسانیت تین مراحل سے گزری ہے: پہلا مذہبی مرحلہ جس میں واقعات کی توجیہ مافوق الفطرت ہستیوں سے کی جاتی تھی، دوسرا مابعد الطبیعیاتی مرحلہ جس میں تجریدی قوتوں کو سبب قرار دیا گیا، اور تیسرا اثباتی یا سائنسی مرحلہ جس میں مشاہدے اور تجربے کو بنیاد بنایا گیا۔ کومت کا خیال تھا کہ سماج کا مطالعہ بھی اسی اثباتی طریقے سے ہونا چاہیے تاکہ سماجی قوانین دریافت کر کے معاشرے کی اصلاح کی جا سکے۔

کومت نے سماج کے مطالعے کو دو حصوں میں تقسیم کیا: سماجی سکونیات جس میں سماجی نظم اور اداروں کے باہمی ربط کا مطالعہ ہوتا ہے، اور سماجی حرکیات جس میں سماجی تبدیلی اور ترقی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ تقسیم آج بھی مطالعہ سماج کی بنیادی تقسیموں میں شامل ہے۔ کومت نے علوم کی درجہ بندی بھی پیش کی جس میں علم معاشرت کو سب سے پیچیدہ اور آخری علم قرار دیا گیا۔ اگرچہ کومت کے بعض خیالات، خصوصاً مذہب انسانیت جیسے تصورات، پر تنقید ہوتی رہی، لیکن اس علم کو نام، موضوع اور سائنسی پروگرام دینے کی خدمت اس قدر بنیادی ہے کہ اس کے بغیر علم معاشرت کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

ہربرٹ اسپنسر اور ٹونس کی خدمات

انگریز مفکر ہربرٹ اسپنسر (1820ء تا 1903ء) نے علم معاشرت کو مقبول عام بنانے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اس نے معاشرے کو ایک جاندار جسم سے تشبیہ دی جس طرح جسم کے اعضا مختلف کام کر کے پورے جسم کی بقا کا سبب بنتے ہیں اسی طرح سماجی ادارے بھی مختلف افعال سرانجام دے کر معاشرے کو قائم رکھتے ہیں۔ اسپنسر نے ارتقا کا نظریہ

سماج پر لاگو کیا اور بتایا کہ معاشرے سادہ اور یکساں حالت سے پیچیدہ اور متنوع حالت کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس نے جنگجو معاشرے اور صنعتی معاشرے کی تقسیم بھی پیش کی۔ اس کی کتب امریکہ اور برطانیہ میں خوب پڑھی گئیں اور یونیورسٹیوں میں اس مضمون کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ البتہ اس کے فطری انتخاب اور عدم مداخلت کے خیالات پر بعد کے مفکرین نے تنقید بھی کی۔

جرمن مفکر فرڈیننڈ ٹونس نے معاشرے کی دو بنیادی صورتوں کا تصور پیش کیا جو آج بھی کلاسیک حیثیت رکھتا ہے۔ پہلی صورت گیمائن شافٹ یعنی وہ قریبی برادری جس میں تعلقات ذاتی، جذباتی اور خاندانی نوعیت کے ہوتے ہیں، جیسے دیہات اور روایتی محلے۔ دوسری صورت گیزل شافٹ یعنی وہ بڑا سماج جس میں تعلقات مقصدی، رسمی اور مفاد پر مبنی ہوتے ہیں، جیسے جدید شہر اور تجارتی ادارے۔ ٹونس کا یہ فرق روایتی اور جدید معاشروں کو سمجھنے میں آج بھی رہنمائی کرتا ہے اور شہری و دیہی علم معاشرت کی بنیادوں میں شامل ہے۔ اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ جدیدیت کے ساتھ انسانی تعلقات کی نوعیت کس طرح بدلتی ہے۔

کارل مارکس کی خدمات

کارل مارکس (1818ء تا 1883ء) اگرچہ اپنے آپ کو ماہر معاشرت نہیں کہتا تھا، لیکن علم معاشرت پر اس کے اثرات کسی سے کم نہیں۔ مارکس نے تاریخی مادیت کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق کسی بھی معاشرے کی بنیاد اس کا معاشی ڈھانچہ یعنی پیداوار کے ذرائع اور پیداواری تعلقات ہوتے ہیں، اور اسی بنیاد پر سیاست، قانون، مذہب اور ثقافت کا بالائی ڈھانچہ قائم ہوتا ہے۔ معاشرے میں مالکان اور محنت کشوں کے درمیان مفادات کا تصادم یعنی طبقاتی کشمکش تاریخ کی اصل محرک قوت ہے۔ مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کا تفصیلی تجزیہ کیا اور مزدور کی بیگانگی، استحصال اور اضافی قدر جیسے تصورات پیش کیے جو آج بھی سماجی بحث کا حصہ ہیں۔

مارکس کی خدمات کا دائرہ صرف معاشیات تک محدود نہیں۔ اس نے یہ دکھایا کہ سماجی اداروں اور افکار کو سمجھنے کے لیے مادی حالات کا مطالعہ ناگزیر ہے اور طاقت و دولت کی تقسیم ہر سماجی مسئلے کی جڑ میں کارفرما ہوتی ہے۔ اس کے نظریات سے علم معاشرت میں تنازعاتی مکتب کی بنیاد پڑی جس نے بعد میں عدم مساوات، طاقت اور سماجی انصاف کے

مطالعے کو فروغ دیا۔ مارکس کے بعض پیش گوئی نما خیالات پر شدید تنقید بھی ہوئی اور اس کے نام سے وابستہ سیاسی تجربات متنازع رہے، تاہم ایک سماجی مفکر کے طور پر اس کے تجزیے کی گہرائی اور وسعت سے انکار ممکن نہیں اور دنیا کی ہر بڑی یونیورسٹی میں اس کا مطالعہ کرایا جاتا ہے۔

جدول: نمایاں مغربی مفکرین اور ان کی بنیادی خدمات

مفکر	ملک و دور	بنیادی خدمت / نظریہ
آگسٹ کومت	فرانس، 1798ء تا 1857ء	سوشیالوجی کی اصطلاح، اثباتیت، تین مراحل کا قانون
ہربرٹ اسپنسر	برطانیہ، 1820ء تا 1903ء	عضویاتی تشبیہ، سماجی ارتقا کا نظریہ
کارل مارکس	جرمنی، 1818ء تا 1883ء	تاریخی مادیت، طبقاتی کشمکش، بیگانگی
ایمیل درخائم	فرانس، 1858ء تا 1917ء	سماجی حقائق، محنت کی تقسیم، خودکشی کا مطالعہ
میکس ویبر	جرمنی، 1864ء تا 1920ء	سماجی عمل کی تفہیم، پروٹسٹنٹ اخلاقیات، نوکر شاہی
فرڈیننڈ ٹونس	جرمنی، 1855ء تا 1936ء	برادری اور سماج (گیمائن شافٹ و گیزل شافٹ) کا فرق

ایمیل درخائم کی خدمات

فرانسیسی مفکر ایمیل درخائم (1858ء تا 1917ء) کو علم معاشرت کو باقاعدہ تعلیمی اور تحقیقی علم بنانے کا سب سے بڑا سہرا دیا جاتا ہے۔ اس نے اس علم کے مطالعے کے اصول وضع کیے اور واضح کیا کہ سماجی حقائق کو اشیا کی طرح سمجھ کر ان کا خارجی مشاہدہ کرنا چاہیے۔ سماجی حقیقت سے اس کی مراد وہ رسوم، قوانین، اقدار اور اجتماعیت شعور ہیں

جو فرد سے پہلے موجود ہوتے ہیں اور فرد کے رویے پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ درخائم نے محنت کی تقسیم پر لکھی گئی کتاب میں دکھایا کہ روایتی معاشروں کو مشینی یکجہتی جوڑتی ہے جبکہ جدید معاشروں میں عضوی یکجہتی پائی جاتی ہے، یعنی افراد مختلف مہارتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے محتاج ہو کر جڑتے ہیں۔

درخائم کی خودکشی پر تحقیق اس لیے سنگ میل سمجھی جاتی ہے کہ اس نے ایک بظاہر خالص انفرادی و نفسیاتی عمل کو شماریاتی شواہد کی بنیاد پر سماجی اسباب سے جوڑ کر دکھایا۔ اس نے خودکشی کی انا پرستانہ، ایثار پسندانہ اور بے ضابطہ اقسام بیان کیں اور دکھایا کہ سماجی ربط کی کمی یا زیادتی اس عمل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ درخائم نے مذہب کے سماجی افعال پر بھی اہم کام کیا اور تعلیم کو سماجی تشکیل کا ذریعہ قرار دیا۔ فرانس میں یونیورسٹی سطح پر اس مضمون کی پہلی مستقل تدریسی نشست اسی کے لیے قائم ہوئی۔ اس کے طریقہ کار اور اجتماعی شعور کے تصور نے بعد کے ساختیاتی و فعالیتی مکتب کی بنیاد رکھی۔

میکس ویبر اور دیگر مفکرین

جرمن مفکر میکس ویبر (1864ء تا 1920ء) نے علم معاشرت کو ایک نئی جہت دی۔ اس کے نزدیک اس علم کا کام سماجی عمل کی تفہیم ہے یعنی یہ سمجھنا کہ انسان اپنے عمل کو کیا معنی دیتا ہے اور دوسروں کے رویے کو سامنے رکھ کر کیسے چلتا ہے۔ اس نے اس مقصد کے لیے مثالی نمونے کا طریقہ وضع کیا۔ ویبر کی شہرہ آفاق بحث پروٹسٹنٹ اخلاقیات اور سرمایہ داری کی روح ہے، جس میں اس نے دکھایا کہ مخصوص مذہبی اقدار نے جدید سرمایہ دارانہ رویے کی تشکیل میں کردار ادا کیا۔ یوں اس نے مارکس کے برعکس افکار اور مذہب کی سماجی قوت کو بھی نمایاں کیا۔ اقتدار کی اقسام یعنی روایتی، قانونی عقلی اور کرشماتی اقتدار کی تقسیم اور نوکر شاہی کا تجزیہ بھی اسی کی خدمات ہیں جو سیاسیات اور انتظامی مطالعات میں آج بھی بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان بڑے ناموں کے علاوہ بھی کئی مغربی مفکرین نے اس علم کو آگے بڑھایا۔ جرمن مفکر گیورگ زیمیل نے چھوٹے گروہوں، شہری زندگی اور سماجی تعامل کی صورتوں کا باریک مطالعہ کیا۔ اطالوی مفکر ولفریدو پیریٹو نے اشرافیہ کی گردش کا نظریہ پیش کیا۔ امریکی مفکرین میں ٹیلکٹ پارسنز نے ساختیاتی فعالیت کو منظم نظام کی صورت دی، رابرٹ مرٹن

نے ظاہری و پوشیدہ افعال اور وسطی سطح کے نظریات پیش کیے اور چارلس کولی اور جارج ہربرٹ میڈ نے ذات اور سماج کے باہمی تعلق پر علامتی تعامل کی بنیاد رکھی۔ ان سب کی مشترکہ کوششوں سے علم معاشرت ایک عالمی علم بن گیا جس کی شاخیں زندگی کے ہر شعبے تک پھیل گئیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ مغربی مفکرین نے علم معاشرت کو نام، موضوع، طریقہ کار اور نظریات عطا کیے۔ کومت نے اس کی بنیاد رکھی، اسپنسر نے اسے وسعت دی، مارکس نے طاقت اور معیشت کے زاویے سے اسے گہرائی بخشی، درخائم نے اسے سائنسی درجہ دلایا اور ویبر نے تفہیمی جہت کا اضافہ کیا۔ طالب علم کے لیے ان خدمات کا انصاف سے جائزہ لینا ضروری ہے؛ جہاں ان نظریات کی علمی قدر مسلم ہے وہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہر مفکر اپنے مخصوص سماجی ماحول کی پیداوار تھا، اس لیے اس کے نظریات کو اپنے معاشرے پر لاگو کرتے وقت مقامی اقدار اور حالات کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اس تنقیدی توازن کے ساتھ یہ فکری ورثہ ہمارے اپنے سماج کو سمجھنے میں بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔

سوال نمبر 3: علم معاشرت میں شاہ ولی اللہ کی خدمات (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ علم معاشرت میں شاہ ولی اللہ کی خدمات بیان کریں۔ (20)

تعارف

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (1703ء تا 1762ء) برصغیر کے عظیم عالم، محدث، مفسر اور سماجی مفکر تھے۔ ان کی زندگی کا دور مغل سلطنت کے زوال، سیاسی انتشار، معاشی ابتری اور سماجی بے چینی کا دور تھا۔ ایسے عالم میں انہوں نے محض دینی علوم کی تدریس و تصنیف پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے معاشرے کے امراض کی تشخیص بھی کی اور اصلاح کا جامع پروگرام بھی پیش کیا۔ ان کی شہرہ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کو اگر بغور پڑھا جائے تو اس میں معاشرے، تہذیب، معیشت، سیاست اور سماجی تبدیلی پر ایسی منظم بحث ملتی ہے جس کی بنا پر انہیں مسلم سماجی فکر کے نمایاں ترین مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس جواب میں شاہ ولی اللہ کی سماجی خدمات کو مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا جائے گا۔ پہلے ان کے مختصر حالات اور علمی ماحول کا جائزہ لیا جائے گا، پھر تمدن کے ارتقا کے بارے میں ان کے مشہور تصور ارتفاقات کی وضاحت ہو گی، اس کے بعد ان کے معاشی و سماجی نظریات، دولت کے ارتکاز پر تنقید، عدل و توازن پر زور اور سیاسی اصلاح کی کوششوں کا ذکر آئے گا۔ واضح رہے کہ یہ تمام بحث ان کی معروف تصانیف میں بیان کردہ افکار کی تعلیمی تلخیص ہے؛ اقتباسات کو لفظ بہ لفظ نقل کرنے کے بجائے مفہوم کو آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے تاکہ کوئی بات نادرست طور پر ان سے منسوب نہ ہو۔

حالات زندگی اور علمی پس منظر

شاہ ولی اللہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم مدرسہ رحیمیہ کے بانی اور نامور عالم تھے۔ شاہ ولی اللہ نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی اور کم عمری میں تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ انہوں نے حجاز مقدس کا سفر کیا اور وہاں کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ وطن واپسی پر انہوں نے تدریس، تصنیف اور اصلاح کا وسیع کام شروع کیا۔ انہوں نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کیا تاکہ عام تعلیم یافتہ طبقہ اسے سمجھ سکے، اور ان کے صاحبزادوں نے اردو ترجمہ کر کے اس سہولت کو مزید عام کیا۔ حدیث کی تدریس کو انہوں نے مرکزیت دی اور موطا امام مالک کو درس کا محور بنایا۔ یہ پس منظر سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ ان کی سماجی فکر کتابی اور خیالی نہیں بلکہ اپنے زوال پذیر معاشرے کے مشاہدے سے جڑی ہوئی تھی۔

شاہ ولی اللہ کے دور میں مغل اقتدار کمزور ہو چکا تھا، صوبے خود مختار ہوتے جا رہے تھے، جاگیرداری نظام عوام پر بوجھ بن چکا تھا اور عام لوگ بالخصوص کسان، کاریگر اور مزدور طبقہ شدید دباؤ میں تھا۔ دوسری طرف اشرافیہ عیش و عشرت میں مبتلا تھی اور علم و اہل علم کی قدر گھٹتی جا رہی تھی۔ شاہ صاحب نے اس صورت حال کو محض سیاسی حادثہ نہیں سمجھا بلکہ اسے سماجی و اخلاقی توازن بگڑنے کا نتیجہ قرار دیا۔ ان کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ معاشرے بیماری کا شکار ہوتے ہیں اور ان کی بیماری کی تشخیص اسی طرح ممکن ہے جس طرح طبیب جسم کی بیماری کی تشخیص کرتا ہے، بشرطیکہ اسباب کو گہرائی سے سمجھا جائے۔ یہی تشخیصی نقطہ نظر ان کی تمام سماجی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

تصور ارتفاقات: تمدن کے مراحل

شاہ ولی اللہ کی سماجی فکر کا سب سے مشہور حصہ انسانی تمدن کے ارتقا کے مراحل ہیں جنہیں انہوں نے ارتفاقات کا نام دیا۔ ان کے نزدیک انسان اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بتدریج سماجی تنظیم کی طرف بڑھتا ہے۔ پہلے مرحلے میں انسان خوراک، لباس اور رہائش جیسی بنیادی ضرورتوں کے سادہ انتظامات کرتا ہے۔ اگلے مرحلے میں خاندان، گھر کی تنظیم، لین دین اور باہمی تعاون کے منظم طریقے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر بستیاں اور گاؤں وجود میں آتے ہیں جہاں پیشے تقسیم ہوتے ہیں اور نگرانی کے ادارے بنتے ہیں۔ اس کے بعد شہر اور ریاست کا مرحلہ آتا ہے جہاں قانون، عدالت اور فوج جیسے ادارے منعقد شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس تجزیے کو جدید مفکرین کے، بشمول مارکس اور دیگر کے، مراحل سے موازنہ کرنے والے محققین نے اسے سماجی ارتقا کی ابتدائی سائنسی توجیہات میں شمار کیا ہے

ارتفاقات کے نظریے کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں انسانی ضروریات، تقسیم کار اور سماجی اداروں کے باہمی تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ شاہ صاحب بتاتے ہیں کہ کوئی فرد اکیلا اپنی تمام ضروریات پوری نہیں کر سکتا؛ روٹی کے لیے کسان، کپڑے کے لیے جولاہا اور اوزار کے لیے لوہار درکار ہے۔ یہی باہمی احتیاج تعاون اور تقسیم کار کو جنم دیتی ہے اور اسی سے تمدن بنتا ہے۔ جب اس نظام میں توازن بگڑ جائے، کوئی طبقہ حاوی ہو جائے یا ضروریات اور وسائل کا ربط ٹوٹ جائے تو معاشرہ زوال کی طرف بڑھتا ہے۔ اس طرح ان کا نظریہ صرف تاریخی بیان نہیں بلکہ سماجی صحت اور بیماری کا اصول بھی فراہم کرتا ہے جس کی روشنی میں آج کے معاشروں کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

جدول: شاہ ولی اللہ کی نمایاں تصانیف اور ان کی سماجی اہمیت

تصنیف	موضوع	سماجی فکر سے تعلق
حجۃ اللہ البالغہ	شریعت کے اسرار اور حکمت	تمدن، معیشت، سیاست اور سماجی توازن پر جامع بحث
ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء	تاریخ خلافت	ریاست، قیادت اور سماجی نظم کا مطالعہ
الانصاف	فقہی اختلافات کے اسباب	اختلاف رائے کے سماجی و علمی اسباب کا تجزیہ

علم کو عام آدمی تک پہنچانے کی سماجی خدمت	ترجمہ قرآن	قرآن مجید کا فارسی ترجمہ
سیاسی اصلاح اور عوامی فلاح کی عملی کوشش	حکمرانوں کو تنبیہ و رہنمائی	سیاسی و اصلاحی خطوط

معاشی و سماجی نظریات

شاہ ولی اللہ نے معاشی زندگی پر گہری سماجی نظر ڈالی۔ انہوں نے تقسیم کار کو تمدن کی بنیاد قرار دیا اور پیشوں کی باہمی عزت پر زور دیا۔ ان کے نزدیک جب دولت چند ہاتھوں میں سمٹ جائے، خوشحالی صرف دربار اور اشرافیہ تک محدود ہو جائے اور محنت کش طبقات کی ضروریات نظر انداز ہونے لگیں تو معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کسانوں اور کاریگروں پر بھاری ٹیکسوں اور جاگیر داری بوجھ پر تنقید کی اور اسے زوال کے اسباب میں شمار کیا۔ یہ تنقید جدید سماجی انصاف کی بحث سے گہری مناسبت رکھتی ہے۔ ان کا نکتہ یہ تھا کہ معاشرے کی اصل طاقت اس کے محنت کش اور پیداکار طبقات ہیں، اس لیے ان کی فلاح کے بغیر کوئی سلطنت دیرپا نہیں رہ سکتی۔

شاہ صاحب نے اعتدال اور توازن کو سماجی زندگی کا مرکزی اصول قرار دیا۔ وہ نہ افراط کے قائل تھے نہ تفریط کے؛ شادی بیاہ اور دیگر رسومات میں فضول خرچی، نمود و نمائش اور تکلفات کی کثرت کو انہوں نے سماجی بگاڑ کے اسباب میں گنا اور سادگی و میانہ روی کی تلقین کی۔ ان کے نزدیک جب لوگ اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرنے لگتے ہیں تو معاشی دباؤ، قرض اور باہمی حسد پیدا ہوتا ہے اور خاندانی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ علم کو اشرافیہ تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اسے عام لوگوں تک پہنچانا سماجی اصلاح کی پہلی شرط ہے، اور یہی جذبہ ان کے ترجمہ قرآن اور سادہ زبان میں تصنیف کے پیچھے کارفرما تھا۔

سیاسی فکر اور اصلاحی کوششیں

سیاسی میدان میں شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی مرکزی قوت کے بکھراؤ کو دور کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھا۔ انہوں نے اپنے خطوط میں حکمرانوں اور امراء کو باہمی اختلافات ختم کرنے، عدل قائم کرنے اور عوام کے حقوق ادا کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ اس دور کے سنگین سیاسی حالات میں انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کی

حالت زار کی طرف توجہ دلائی، جس کے نتیجے میں پانی پت کی تیسری جنگ (1761ء) کا واقعہ پیش آیا جس نے مرہٹہ قوت کو فیصلہ کن دھچکا پہنچایا۔ مورخین اس اقدام کے اثرات پر بحث کرتے رہے ہیں، لیکن اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی سماجی فکر صرف کتب تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ اپنے معاشرے کی عملی اصلاح کے لیے بھی کوشاں تھے۔

ان کی سماجی خدمات کا ایک اور پہلو علمی و دینی بیداری کی تحریک ہے۔ انہوں نے اندھی تقلید کے بجائے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کی دعوت دی، فقہی اختلافات کے اسباب پر الانصاف لکھ کر شدت پسندی کم کرنے کی کوشش کی اور اپنے شاگردوں کا ایسا حلقہ تیار کیا جس نے آگے چل کر برصغیر میں اصلاحی تحریکوں کی بنیاد رکھی۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے خانوادے نے اس مشن کو آگے بڑھایا۔ یوں ان کی کاوشوں کے اثرات ان کی زندگی کے بعد بھی نسل در نسل نظر آتے ہیں۔ جدید محققین نے حجۃ اللہ البالغہ کے سماجی حصوں کا تقابلی مطالعہ کر کے انہیں ابن خلدون کے بعد مسلم سماجی فکر کا سب سے بڑا نام تسلیم دیا ہے اور بعض نے ان کے ارتفاقات کے نظریے کو جدید نظریات کا پیش رو تسلیم کیا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کی خدمات دینی علوم تک محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے اپنے معاشرے کو ایک مفکر اور مصلح کی نظر سے دیکھا۔ تمدن کے مراحل یعنی ارتفاقات کا نظریہ، تقسیم کار اور باہمی تعاون کی اہمیت، دولت کے ارتکاز پر تنقید، محنت کش طبقات کی فلاح پر زور، اعتدال اور سادگی کی تلقین، علم کی اشاعت اور سیاسی بیداری کی کوششیں ان کی سماجی خدمات کے روشن عنوانات ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سماجی مسائل کو دینی و اخلاقی اصولوں کی روشنی میں سمجھنے کا ڈھنگ سکھایا اور بکھرتے ہوئے معاشرے کو توازن کی طرف لوٹنے کی دعوت دی۔ آج کے پاکستانی معاشرے کے مسائل پر غور کرتے ہوئے بھی ان کا تشخیصی اور متوازن نقطہ نظر طالب علم کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوال نمبر 4: اسلام میں خاندان کا تصور (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ اسلام میں خاندان کا تصور بیان کریں۔ (20)

تعارف

خاندان انسانی معاشرے کی بنیادی اور اولین اکائی ہے۔ ہر انسان اپنی زندگی کا آغاز خاندان سے کرتا ہے، اسی میں پرورش پاتا ہے، زبان، اخلاق، اقدار اور زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھتا ہے۔ اگر خاندان مستحکم ہو تو معاشرہ مستحکم ہوتا ہے اور اگر خاندان بکھر جائے تو اس کے اثرات پورے سماج پر پڑتے ہیں۔ اسلام نے خاندان کو محض اتفاقی ساتھ رہنے کا نام نہیں دیا بلکہ اسے ایک باقاعدہ، پائیدار اور مقدس ادارہ قرار دیا ہے جس کی بنیاد نکاح کے معاہدے پر ہے اور جس کے ہر رکن کے حقوق و فرائض متعین کر دیے گئے ہیں۔

اس جواب میں اسلام کا تصور خاندان مختلف پہلوؤں سے بیان کیا جائے گا۔ پہلے نکاح کی حیثیت اور خاندان کی بنیادیں واضح کی جائیں گی، پھر خاندان کے مقاصد، میاں بیوی کے باہمی حقوق، والدین اور اولاد کے تعلقات، وسیع خاندانی نظام یعنی صلہ رحمی، اور خاندان کے سماجی افعال پر بحث ہو گی۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ اسلام کا خاندانی تصور مغرب کے انفرادی رجحانات اور مشرق کی جابرانہ رسومات دونوں سے کس طرح مختلف اور متوازن ہے۔ یہ بحث خالصتاً علمی نوعیت کی ہے؛ کسی خاص شرعی مسئلے پر حتمی رائے کے لیے اہل علم سے رجوع ہی درست طریقہ ہے۔

خاندان کی بنیاد: نکاح

اسلام میں خاندان کی بنیاد نکاح ہے۔ نکاح ایک جائز اور اعلانیہ معاہدہ ہے جس کے ذریعے مرد و عورت میاں بیوی کے رشتے میں بندھتے ہیں۔ اسلام رہبانیت یعنی شادی سے گریز کو پسند نہیں کرتا بلکہ نکاح کو قدرتی اور متوازن زندگی کا راستہ قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید میں خاندانی زندگی کو سکون، محبت اور رحمت کا ذریعہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اسی کی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ وہ ان سے سکون حاصل کرے اور ان کے درمیان محبت و رحمت پیدا کی۔ سورہ روم کی اس آیت کو خاندان کے اسلامی تصور

کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس میں شادی کا مقصد محض نفسانی تسکین نہیں بلکہ ذہنی سکون، قلبی محبت اور باہمی رحم دلی بتایا گیا ہے۔ مہر کو بھی اسی نظام میں عورت کا حق قرار دیا گیا ہے تاکہ تعلق ذمہ داری اور وقار کے ساتھ قائم ہو۔

نکاح کو اسلام میں عبادت کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ سے اسے سادگی اور آسانی سے انجام دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ غیر ضروری رسومات، جہیز کے بھاری مطالبات اور نمود و نمائش خاندان کی بنیاد کو کمزور کرتی ہیں، اس لیے علماء ہمیشہ ان کی حوصلہ شکنی کرتے آئے ہیں۔ نکاح کے لیے گواہوں کی موجودگی اور ولی کی سرپرستی جیسی شرائط بھی خاندان کو سنجیدگی اور تحفظ دینے کے لیے ہیں۔ اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ اسلامی خاندان چھپے ہوئے تعلق کا نام نہیں، بلکہ سماج کے سامنے قبول کی گئی ذمہ داری ہے جس میں دونوں فریقوں کی عزت، اولاد کا نسب اور حقوق محفوظ ہوتے ہیں۔ یہی ذمہ داری اس ادارے کو محض معاہدے سے بڑھ کر اخلاقی و روحانی بندھن بنا دیتی ہے۔

خاندان کے مقاصد اور افعال

اسلامی تصور میں خاندان کے مقاصد کثیر الجہت ہیں۔ پہلا مقصد فطری جذبات کی جائز اور پر سکون تسکین اور عفت و پاکدامنی کا تحفظ ہے۔ دوسرا مقصد نسل انسانی کی بقا اور اولاد کی پرورش و تربیت ہے، کیونکہ بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود اور گھر کا ماحول ہوتا ہے اور یہیں سے اس کی شخصیت، اخلاق اور مستقبل کی سمت متعین ہوتی ہے۔ تیسرا مقصد معاشی و سماجی تعاون ہے؛ خاندان رزق کی جستجو، بیماری و بڑھاپے کی دیکھ بھال اور مشکل وقت میں سہارا دینے کا قدرتی نظام فراہم کرتا ہے۔ چوتھا مقصد اقدار کی منتقلی ہے کہ دیانت، صبر، ایثار اور احترام جیسی صفات لکھے ہوئے قوانین سے زیادہ گھریلو ماحول سے منتقل ہوتی ہیں۔ اس لیے اسلامی معاشرت میں خاندان کو محض نجی معاملہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ پورے سماج کی صحت کا پیمانہ مانا جاتا ہے۔

جدول: خاندان کے بنیادی افعال اور اسلامی رہنمائی

اسلامی رہنمائی	مفہوم	فعل
والدین کی ذمہ داری اور نیک نمونہ	بچوں کی اخلاقی و دینی پرورش	تربیت و تشکیل شخصیت

نفقہ کی ذمہ داری اور اسراف سے پرہیز	رزق، کفالت اور مشترکہ ذمہ داری	معاشی تعاون
سکینت، مودت اور رحمت کا تصور	محبت، رحمت اور سہارا	جذباتی سکون
صلہ رحمی اور قریبی رشتوں کی کفالت	بیماری، بڑھاپے اور مصیبت میں کفالت	سماجی تحفظ
گھریلو ماحول اور عملی نمونہ	اخلاق و روایات اگلی نسل تک	اقدار کی منتقلی

جدید ماہرین معاشرت بھی خاندان کے تقریباً یہی افعال بیان کرتے ہیں، لیکن اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ان افعال کو قانون و اخلاق دونوں کی ضمانت دی ہے۔ جب تربیت کو عبادت کا درجہ مل جائے، والدین کی خدمت کو ثواب سمجھا جائے اور رشتہ داروں کے حقوق، قانونی نظام کے ساتھ دینی تعلیم کا حصہ بھی بن جائیں تو خاندانی نظام کو وہ استحکام حاصل ہوتا ہے جو محض قانون سے ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دور کے شدید انفرادی رجحانات کے مقابلے میں بھی مسلمان معاشروں میں خاندانی ربط نسبتاً مضبوط رہا ہے۔

میاں بیوی اور والدین و اولاد کے حقوق

اسلامی خاندان حقوق و فرائض کے توازن پر قائم ہے۔ میاں بیوی کے تعلق کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے، یعنی وہ ایک دوسرے کے لیے پردہ پوشی، راحت اور تحفظ کا سبب ہیں۔ شوہر پر اہل خانہ کی مناسب کفالت اور حسن سلوک کی ذمہ داری ہے، جبکہ گھر کے نظم و نسق اور اولاد کی روزمرہ تربیت میں بیوی کا کردار مرکزی تسلیم کیا گیا ہے۔ دونوں پر باہمی مشاورت، نرمی اور اختلاف کی صورت میں انصاف و احسان سے کام لینے کی تاکید ہے۔ زبردستی اور ظلم کی اس نظام میں کوئی گنجائش نہیں؛ حتیٰ کہ جدائی کی نوبت بھی آئے تو اس کے لیے بھی باقاعدہ، منصفانہ اور وقار سے بھرے ضوابط مقرر ہیں تاکہ کمزور فریق کے حقوق ضائع نہ ہوں۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اسلام نے عبادت کے بعد سب سے زیادہ تاکید والا حق قرار دیا ہے؛ ان کی خدمت، ان سے نرمی سے گفتگو اور بڑھاپے میں ان کی دیکھ بھال اولاد کے بنیادی فرائض ہیں۔ دوسری طرف والدین پر اولاد کی تعلیم و تربیت، ان کے درمیان انصاف اور ان کے لیے جائز رزق کی کوشش فرض کی گئی ہے۔ یہ باہمی نظام

بڑھاپے کی بے بسی اور بچپن کی بے یار و مددگاری دونوں کا علاج ہے۔ اسی ربط کو وسیع کر کے صلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے کہ قریبی رشتہ داروں سے تعلق جوڑا جائے، ان کی خوشی غمی میں شریک ہوا جائے اور ضرورت کے وقت ان کی مدد کی جائے۔ یوں اسلامی خاندان صرف میاں بیوی اور بچوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ دادا دادی، چچا خالہ اور دیگر رشتوں کو شامل کر کے ایک وسیع سماجی حفاظتی نظام بن جاتا ہے۔

جدید چیلنجز اور اسلامی تصور کی اہمیت

جدید دور میں خاندانی نظام کئی چیلنجز سے دوچار ہے۔ مغرب میں انفرادیت کے فروغ سے شادی کے بغیر ساتھ رہنے، اکیلے زندگی گزارنے اور بڑھاپے میں تنہائی کے مسائل بڑھے ہیں۔ ہمارے اپنے معاشرے میں مہنگائی، جہیز، برادری کی کھنچاؤ، مشترک خاندانی نظام کے زوال، موبائل اور سوشل میڈیا کا بے محل استعمال اور بیرون ملک ملازمت کی وجہ سے علاحدگی جیسے مسائل خاندان کو متاثر کر رہے ہیں۔ ان حالات میں اسلامی تصور خاندان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ اعتدال پیش کرتا ہے: نہ فرد کو خاندان کے نام پر کچل دیا جاتا ہے اور نہ خود غرض آزادی کے نام پر رشتوں کو بے معنی کیا جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان چیلنجز کا عملی حل نکاح کو آسان بنانے، غیر ضروری رسومات ترک کرنے، میاں بیوی کی باہمی تربیت، اولاد کے لیے وقت نکالنے اور بزرگوں کا احترام بحال کرنے میں ہے۔ مشترک اور نیوکلیئر خاندان میں سے کسی صورت کو بھی حتمی قرار دینے کے بجائے اصل پیمانہ عدل، احترام اور ذمہ داریوں کی ادائیگی ہونا چاہیے؛ جہاں یہ اقدار ہوں وہاں خاندان سکون کا سبب بنتا ہے۔ ریاستی سطح پر بھی خاندانی قوانین، ماؤں و بچوں کی صحت اور تعلیم کی پالیسیاں اسی ادارے کو مضبوط کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاندان کا اسلامی تصور قدیم روایت نہیں بلکہ ہر دور کے سماجی استحکام کی بنیاد ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں خاندان نکاح پر قائم ایک مقدس، ذمہ داری پر مبنی اور متوازن ادارہ ہے جس کے مقاصد میں سکون و محبت، عفت کا تحفظ، نسل کی تربیت، معاشی تعاون اور اقدار کی منتقلی شامل ہیں۔ اس نظام میں میاں بیوی، والدین، اولاد اور قریبی رشتہ دار سب کے حقوق و فرائض متعین ہیں اور ان کا مدار محض قانون پر نہیں بلکہ ایمان،

اخلاق اور اخروی جواب دہی پر بھی ہے۔ جدید دور کے خاندانی بحران اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ جب خاندان کو محض انفرادی پسند کا مسئلہ بنا دیا جائے تو نقصان پورے معاشرے کو ہوتا ہے۔ اس لیے اسلامی تصور خاندان کا مطالعہ اور اس پر عمل معاشرتی امن و سکون اور آنے والی نسلوں کی درست تربیت کے لیے ناگزیر ہے۔

سوال نمبر 5: اسلام میں مدرسہ کی اہمیت و کردار (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ اسلام میں مدرسہ کی اہمیت و کردار بیان کریں۔ (20)

تعارف

مدرسہ اسلام کی تعلیمی تاریخ کا وہ ادارہ ہے جس نے صدیوں تک علم کی حفاظت، اشاعت اور منتقلی کا فریضہ سرانجام دیا۔ اسلام کی پہلی دینی درس گاہ کا نمونہ صفہ کو قرار دیا جاتا ہے، جہاں مسجد نبوی سے ملحق چبوترے پر مہاجر صحابہ کرام تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر مختلف علاقوں میں معلم بن کر جاتے تھے۔ مسجد سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ بتدریج باقاعدہ مدارس کی صورت اختیار کرتا گیا اور بغداد سے قرطبہ تک اور دہلی سے تیمبکتو تک مدارس کا جال بچھ گیا، جن میں دینی علوم کے ساتھ طب، ریاضی، فلکیات اور ادب جیسے علوم بھی پڑھائے جاتے رہے۔

اس جواب میں مدرسے کی اہمیت و کردار کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا جائے گا۔ پہلے مدرسے کا مفہوم اور اس کی مختصر تاریخ پیش ہو گی، پھر علم دین کی حفاظت، علماء کی تیاری، عام آدمی کی دینی رہنمائی، کردار سازی اور سماجی خدمات کے حوالے سے اس کا کردار واضح کیا جائے گا۔ آخر میں دور حاضر کے چیلنجز، ان کے حل اور مستقبل کی تجاویز کے ساتھ نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔ اس دوران یہ بات بھی پیش نظر رہے گی کہ مدرسے کی تاریخی خدمات کا اعتراف اور اس کی موجودہ اصلاح کی ضرورت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں کو انصاف سے دیکھنا چاہیے۔

مدرسے کا مفہوم اور مختصر تاریخ

مدرسہ عربی لفظ درس سے بنا ہے جس کے معنی سبق پڑھنا پڑھانا ہیں؛ اس لیے مدرسے سے مراد وہ جگہ ہے جہاں درس دیا جائے۔ اصطلاح میں مدرسہ وہ باقاعدہ تعلیمی ادارہ ہے جہاں استاد اور طلبہ ایک مقررہ نصاب کے تحت علوم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ابتدائی صدیوں میں تعلیم کا مرکز مسجد تھی، لیکن جب علوم وسعت پذیر ہوئے، طلبہ دور دراز سے آنے لگے اور وقف کی صورت میں وسائل میسر آئے تو مسجد کے ساتھ رہائشی و تدریسی مدارس قائم ہونے لگے۔ ان مدارس میں طلبہ کے لیے قیام و طعام، کتب خانہ اور اساتذہ کی تنخواہوں کا انتظام عام طور پر وقف سے ہوتا تھا، جس کی وجہ سے تعلیم غریب طلبہ کے لیے بھی مفت اور قابل رسائی رہی۔

مدرسے کے باقاعدہ عروج کا دور گیارہویں صدی عیسوی سے جوڑا جاتا ہے جب سلجوقی وزیر نظام الملک نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ (قائم شدہ 1065ء) کی بنیاد رکھی اور سلطنت کے مختلف شہروں میں اسی طرز کے مدارس قائم کیے۔ ان مدارس میں امام غزالی جیسے عظیم استاد تدریس کرتے رہے۔ بعد ازاں ایوبی اور مملوک دور کے مصر و شام، عثمانی دور کے ترکی اور مغلیہ دور کے ہندوستان میں مدارس کا وسیع نظام قائم ہوا۔ ہندوستان میں درس نظامی کا مشہور نصاب ملا نظام الدین فرنگی محلی سے منسوب ہے جس میں منطق، فقہ، اصول، حدیث، تفسیر اور عربی ادب کو توازن سے شامل کیا گیا اور یہ نصاب صدیوں تک برصغیر کے مدارس کی بنیاد رہا۔ اس تاریخی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ اسلامی تہذیب کا ایک مرکزی ادارہ رہا ہے۔

علم دین کی حفاظت اور علماء کی تیاری

مدرسے کا سب سے پہلا اور بڑا کردار قرآن و سنت کے علم کی حفاظت اور اس کی نسل در نسل منتقلی ہے۔ حفظ قرآن، تجوید، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ جیسے علوم کتابوں کے علاوہ اہل علم کی صحبت اور سند کے ذریعے منتقل ہوتے ہیں۔ مدارس نے اس روایت کو زندہ رکھا؛ مشکل ترین ادوار، حتیٰ کہ تاتاری یلغار اور استعماری دور میں بھی جب ریاستی سرپرستی ختم ہو چکی تھی، مدارس نے ہی دینی شعور کو محفوظ رکھا۔ برصغیر میں انگریز دور کے بعد مسلمانوں کی دینی تعلیم کا تسلسل بڑی حد تک مدارس ہی کی بدولت قائم رہا، اور دارالعلوم دیوبند جیسے اداروں نے عوامی چندے کے نظام سے تعلیم جاری رکھنے کا نمونہ پیش کیا۔

دوسرا بڑا کردار ایسے علماء وماہرین کی تیاری ہے جو معاشرے کی دینی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ مساجد کے ائمہ و خطباء، نکاح وجنازہ اور نماز وروزہ کی رہنمائی کرنے والے اہل علم، مدارس کے اساتذہ، مفتیان اور مصنفین اسی نظام سے تیار ہوتے ہیں۔ اگر یہ ادارے نہ ہوں تو عام مسلمان کے لیے عبادات اور دینی مسائل کی مستند رہنمائی کا ذریعہ ختم ہو جائے اور افتراق وانتہاپسند تشریحات کے لیے میدان خالی ہو جائے۔ یہ بھی یاد رہے کہ کسی فرد کے بارے میں شرعی حکم کا اطلاق یا فتویٰ دینا تربیت یافتہ علماء اور باقاعدہ اداروں کا کام ہے؛ مدرسے کی تعلیم اسی اہلیت کی تیاری کا نام ہے، نہ کہ ہر طالب علم کو خود سے فیصلے کا اختیار دینا۔

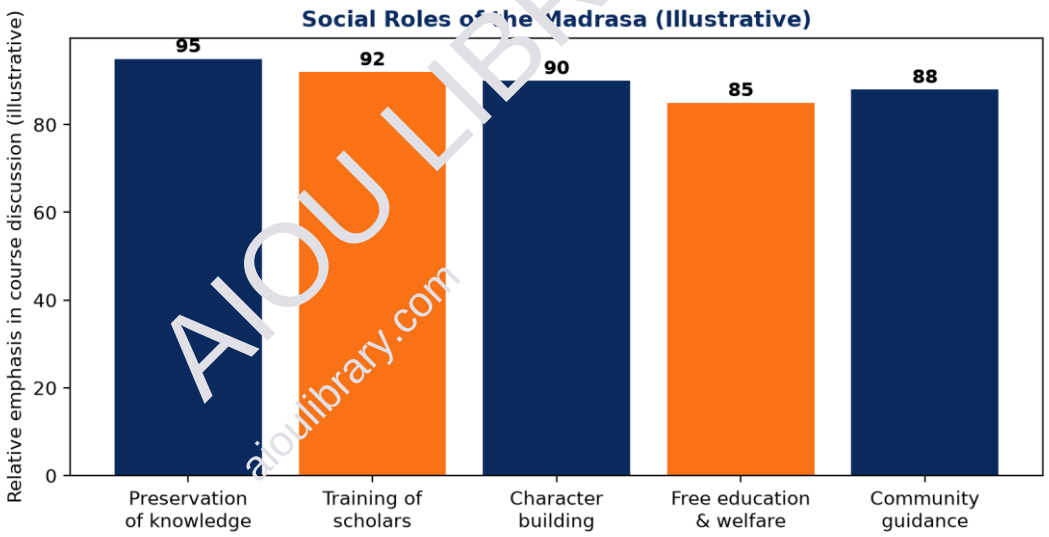

شکل: مدرسے کے سماجی کردار کے اہم پہلو (مطالعے کے لیے تمثیلی خاکہ)

کردار سازی اور سماجی خدمات

مدرسہ صرف معلومات منتقل نہیں کرتا بلکہ کردار بھی بناتا ہے۔ رہائشی ماحول میں استاد کی صحبت، نماز باجماعت اور ذکر و مطالعے کی پابندی، سادہ زندگی اور وقت کی قدر طلبہ کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ یہی کرداری تربیت اسلامی تعلیم کا اصل مقصد ہے کیونکہ علم بغیر عمل کے معاشرے میں فساد بھی پیدا کر سکتا ہے۔ مدارس سے فارغ التحصیل لوگ عام طور پر اپنے علاقے میں اخلاقی اثر ورسوخ رکھتے ہیں اور نکاح و صلح، نزاعات کے حل اور غم خوشی میں شرکت کے ذریعے مقامی سماجی ڈھانچے کو مضبوط کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے مدرسہ ایک ہی وقت میں تعلیمی، اخلاقی اور سماجی ادارہ ہے۔

سماجی خدمات کے میدان میں بھی مدارس کا کردار نمایاں رہا ہے۔ مدارس کے ساتھ عام طور پر مسجد، مکتب اور کتب خانے جڑے ہوتے ہیں، نادار طلبہ کو مفت تعلیم، رہائش اور کھانا ملتا ہے اور بہت سے مدارس یتیم بچوں کی کفالت بھی کرتے ہیں۔ گاؤں اور محلے کے بچوں کو ناظرہ قرآن کی تعلیم دینے کا وسیع نظام بڑی حد تک انہی اداروں سے وابستہ ہے۔ سیلاب اور وبا جیسی ہنگامی صورتوں میں بھی دینی مدارس اور ان سے وابستہ ادارے امدادی کاموں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ یہ خدمات اس بات کا ثبوت ہیں کہ مدرسے کا کردار کتاب اور درس گاہ تک محدود نہیں بلکہ وہ معاشرے کی عملی خدمت کا ادارہ بھی ہے۔

جدول: مدرسے کے کردار کے اہم پہلو

سماجی فائدہ	کردار	پہلو
دینی تسلسل اور مستند رہنمائی	قرآن، حدیث، فقہ کی تدریس و اشاعت	حفاظت علم
معاشرے کی دینی ضروریات کی تکمیل	ائمہ، اساتذہ اور محققین کی تربیت	تیاری علماء
اخلاق و عمل کی تشکیل	استاد کی صحبت اور دینی ماحول	کردار سازی
کمزور طبقات کا سہارا	مفت تعلیم، کفالت اور مقامی رہنمائی	سماجی خدمت
تہذیبی شناخت کی بقا	زبان، ادب اور روایت کا تحفظ	ثقافتی تحفظ

دور حاضر کے چیلنجز اور اصلاح کی ضرورت

موجودہ دور میں مدارس کو کئی چیلنجز درپیش ہیں۔ نصاب کے بارے میں بحث ہوتی رہتی ہے کہ اس میں عصری ضروریات یعنی کمپیوٹر، انگریزی، سماجی علوم اور پیشہ ورانہ مہارتوں کو کس حد تک شامل کیا جائے تاکہ فارغ التحصیل طلبہ عملی زندگی میں بھی بہتر کردار ادا کر سکیں۔ مالی وسائل کی کمی، درجہ بندی و رجسٹریشن کے انتظامی مسائل اور مدارس کے

بارے میں پھیلنے والی غلط فہمیاں بھی ان چیلنجز میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ معاشرے کی توقع یہ بھی ہے کہ مدرسے امن، رواداری اور قانون کی پاسداری کی تعلیم میں اپنا مثبت کردار مزید واضح کریں، جو درحقیقت اسلام کی اصل تعلیمات کی ترجمانی بھی ہے۔

ان چیلنجز کا حل جذباتی دفاع یا کلی انکار میں نہیں بلکہ تدریجی اور سرامن اصلاح میں ہے۔ نصاب میں توازن یعنی دینی علوم کی گہرائی برقرار رکھتے ہوئے بنیادی عصری مہارتوں کا اضافہ، اساتذہ کی تربیت، امتحانی نظام کی بہتری، کتب خانوں اور تحقیق تک وفروغ اور ریاستی اداروں سے شفاف تعاون ایسے اقدامات ہیں جن پر علماء اور پالیسی ساز گفتگو کرتے آئے ہیں۔ اصلاح کا اصل مقصد مدرسے کی شناخت ختم کرنا نہیں بلکہ اس کے اصل مقصد یعنی علم دار کی تیاری کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق مؤثر بنانا ہے۔ تاریخی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جب مدارس اپنے دور کی ضرورتوں سے جڑے رہے تو انہوں نے غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسی شخصیات پیدا کیں؛ اس لیے جمود کے بجائے تجدید ہی اس ادارے کی روایت ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ مدرسہ اسلام کا بنیادی تعلیمی ادارہ ہے جس نے صدیوں تک علم دین کی حفاظت، علماء کی تیاری، کردار سازی اور سماجی خدمت کا فریضہ ادا کیا ہے۔ مسجد نبوی کے صفہ سے نظامیہ بغداد تک اور درس نظامی سے آج کے ہزاروں دینی اداروں تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان جیسے معاشرے میں جہاں آبادی کی بڑی تعداد دینی رہنمائی کے لیے انہی اداروں کی طرف دیکھتی ہے، مدارس کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ البتہ دور حاضر میں ان کی تاثیر برقرار رکھنے کے لیے متوازن نصاب، اہل اساتذہ اور پرامن اصلاح ناگزیر ہے۔ طالب علم کو اس ادارے کو اس کے تاریخی پس منظر اور موجودہ تقاضوں کے ساتھ سمجھنا چاہیے تاکہ اس کا جائزہ تعصب سے ہٹ کر علمی اور انصاف پر مبنی ہو۔